Date of Publication : 16-05-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 May 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 May 2014
Issue: 20, Vol.: 73

۲۲ تا ۲۸ مئی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۲۰، جلد نمبر: ۷۳

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

علی احمد فاطمی (شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، یوپی)

اگر یہ سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک اردو کی سب سے بڑی تحریک رہی ہے اور اس نے ہندوستانی زبان و ادب پر بالعموم اور اردو زبان و ادب پر بالخصوص غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں۔ عوامی ادب، احتجاجی ادب اور سماجی ادب کی ایک ناقابل فراموش تاریخ لکھی ہے۔ ادب کی معیار پرست، روایتی شعریات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں ورنہ اس سے قبل للکار، انقلاب، احتجاج وغیرہ کا ذکر تک معیوب اور خلاف معیار سمجھا جاتا تھا۔ نظیر اکبرآبادی سے لے کر نذیر بنارسی تک کی ایک لمبی روایت کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ ایک بڑا اور پوشیدہ سچ یہ بھی رہا کہ ترقی پسندی صرف ایک کی محتاج نہیں رہی۔ ہر دور میں ترقی پسندی رہی ہے۔ حافظ و رومی کے یہاں بھی، کبیر اور نظیر کے یہاں بھی، میر و غالب، اقبال و جوش بھی ترقی پسند تھے۔ انسان اور انسانیت پر یقین رکھتے تھے۔ ایک لمبی روایت، تہذیبی وراثت۔

لیکن آج ترقی پسندی و انسان دوستی کہاں گم ہوگئی ہے۔ آج کے خراب حالات اور دوران انتخابات میں وہ نہ جانے کہاں گم ہے سب کہتے ہیں کہ وہ ختم ہوگئی لیکن میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں۔ کچھ اخبار کے تراشوں میں فرقہ واریت کا خوف و ڈر اور مودی آیا مودی آیا کا شور و غل سنا کر یا دکھا کر ترقی پسندی اپنے وجود کو زندہ تو کیے ہے لیکن سوال یہ بھی ہے کہ فرقہ واریت آئی ہی کیوں؟ مودی ازم آیا ہی کیوں۔ سیکولرزم گیا ہی کیوں۔ بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتیں روپوش کیوں۔ ترقی پسند ادیب خاموش کیوں؟ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ موجودہ بے ہنگم اور بے ہنگم شور و غل میں یا آج کے سماجی و سیاسی ماحول میں ان کی آواز ہی کہاں ہے۔ ادب تو بقول پریم چند سیاست کے آگے آگے چلنے والی مشعل کا نام ہے لیکن آج سیاست کے پیچھے پیچھے ادب خواہ وہ نہ ہو لیکن ادیب تو ہو ہی گئے ہیں — بلکہ تو باقاعدہ سیاست دانوں کے بلکہ لگوا ہوگئے ہیں مفادات حاوی ہوگئے ہیں جس کا صلہ انھیں مختلف اداروں کے صدر، چیئرمین وغیرہ کی شکل میں مل رہا ہے۔ کیا دور تھا جب بڑے ادیبوں و دانش وروں کے آگے سیاست داں درخواست کرتے تھے کہ عہدے کو عزت بخشیے۔ آج شعرا و ادبا گڑگڑاتے رہتے ہیں کہ میری عزت و دولت میں اضافہ کیجیے خواہ ہمیں اپنی عزت نفس کا کیسا ہی سودا کرنا پڑے معافی چاہوں گا کہ رو قلم میں آگیا۔ میں تو بات کر رہا تھا ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کی، وہ ترقی پسند جو مارکس لینن کی بات کرتے ہیں۔ پریم چند، سجاد ظہیر کی بات کرتے ہیں لیکن یہ نہیں غور کرتے کہ پریم چند اور سجاد ظہیر کی ترقی پسندی اس لیے متوجہ کرتی تھی کہ ان کی فکری ہی نہیں عملی و قلمی زندگی بھی فقیرانہ اور دانش ورانہ تھی ان کا کمٹ منٹ صرف نظریے میں نہیں زندگی کے عام رویے میں بھی تھا۔ آج ایسا نہیں ہے۔ آج ترقی پسندی ایک بوسیدہ لباس بن چکی ہے جس کے کپڑے تار تار ہو چکے ہیں لیکن آج کے ترقی پسندوں کے لباس، گھر، گاڑی جگمگا رہے ہیں۔ یہ سب یونہی تو نہیں ہوا۔ اس کے صد فی صد ذمہ دار خود ترقی پسند ہیں، ترقی پسند جماعتیں ہیں جن کا کردار، نظریہ، رویہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ان کی خاموشی، علاحدگی، ان کی ناکامی اور بے بسی کو ظاہر کرتی ہے۔ جب کہ عوام پریشان ہے۔ کیا کرے، کدھر جائے، کیسے بھاگ دوڑ سوچنے کہ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں جو سفید پوش ہیں وہ اس ننگے پن کا سامنا نہیں کر پا رہے ہیں۔ ایک غریب عام آدمی کی ذکی، لوگ متبادل کی تلاش میں اس پر ٹوٹ بھی پڑے ترقی پسند اس وقت بھی خاموش تماشائی بنے رہے جبکہ وہ اسی طرح چرمرا گئی جیسے ایک کمزور چارپائی پر چند درجن لوگ بیٹھ جائیں اور وہ ٹوٹ جائے۔ ترقی پسندوں نے اس کی آواز بھی نہیں سنی اور منطقی دلائل پیش کرتے ہوئے، موٹے موٹے چشمے لگا کے بحث کرتے رہے، کافی پیتے رہے، سگار کے دھوئیں میں سب اڑاتے رہے۔ بزرگ ادیبوں کی رسمی سی صدیاں مناتے رہے اور خوش ہوتے رہے کہ وہ اس تنظیم کے صدر ہیں، جنرل سکریٹری ہیں، پروفیسر ہیں یا کسی بوسیدہ رسالے کے اڈیٹر ہیں۔ وہ سب کچھ ہیں لیکن اب عوام کے نہیں ہیں۔ عوامی رشتے، سماجی سروکار، سب ختم ہوگئے اور اب تو عوام نے بھی انھیں نکار دیا اور خود فسطائیت، فرقہ واریت سے لڑنے پر اتر آئے ہیں لیکن اس درمیان ایک حتمی بات یہ تو ہوئی ہی کہ ترقی پسند دانش وروں، لیڈروں کی خاموشی و علاحدگی نے جو خلا ہوا اسے بھرا مافیاؤں نے اور تمام تجار مذہبی رہنماؤں نے اور پس پردہ تاجروں اور صارفوں نے اور دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس برس میں ہندوستان کی جمہوری سیاست میں تجارت و صارفیت کا بول بالا ہوگیا اور اسے موافق آئی فرقہ واریت یا مودی ازم... اسی لیے صرف فرقہ پرست سیاسی جماعتوں نے ہی نہیں بڑے بڑے تاجر گھرانوں نے بھی مودی کو وزیر اعظم کے لیے منتخب کیا اس لیے، کہ مودی صرف ایک شخص نہیں وہ فرقہ واریت اور اب فسطائیت کی علامت بن چکے ہیں اور تجارت و دولت صرف اپنی ہوس زر پر نظر رکھتی ہے۔ ملک و ملت پر نہیں۔ ایک تاجر چار پیسوں کے فائدے کے لیے ملک کو جہنم بھی بنا سکتا ہے اُسے تو صرف فائدہ چاہیے۔ ہندوستان کا معصوم و مظلوم انسان اب ان چیزوں کو سمجھنے لگا ہے اور ان سے بچنے کی تدبیروں پر بھی غور کرنے لگا ہے اور ان فرقہ پرستوں اور ہوس پرستوں سے تو نپٹ بھی لے گا کہ جمہوریت میں بڑی طاقت ہوتی ہے لیکن وہ ان سفید پوشوں، دانش وروں سے کیسے نپٹے جو سیکولرزم یا ترقی پسندی کے نام پر عوام کے درمیان جانے کے بجائے عوام سے کٹ گئے ہیں اور بعض پروفیسران تو اس قدر مفاد پرست ہوگئے ہیں کہ وہ امتحان سے لے کر انتخاب تک بے ایمانی کرنے میں پیچھے نہیں رہتے۔ انھیں نہ گجرات سے مطلب اور نہ آج کے حالات سے کچھ لینا دینا، وہ تو بس بقول اکبر الہ آبادی:

اکبر نے کہا یہ بات غلط ہے نہیں تو کچھ بھی نہیں
بابک نے کہا سب بات غلط گو نہیں تو کچھ بھی نہیں

چلیے مان لیتے ہیں کہ بابری مسجد کی شہادت، گجرات کے المناک حقیقت پر چند کہانیاں لکھی گئیں، تھوڑی بہت شاعری بھی ہوئی لیکن اس کے بعد خاموشی اور علاحدگی۔ نئے ادیبوں و شاعروں کو بہت کچھ کہا جاتا ہے، غیر سنجیدہ، غیر ذمہ دار، کم پڑھے لکھے وغیرہ۔ چلیے مان لیتا ہوں کہ یہ سب سچ ہوگا لیکن میں اپنے محترم و بزرگ ادیبوں سے بھی سوال کرتا ہوں کہ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں انھوں نے سماجی زندگی اور تہذیبی و اقداری الٹ پھیر کے بارے میں کیا سوچا، کیا لکھا اور کیا ایسے موضوعات پر سوچنا و لکھنا ضروری

بھی ہے؟ کیا ادب کے فن اور جمالیات کے ایسے موضوعات بے معنی ہیں؟ کیا ادیب خلا میں پیدا ہوتا ہے؟ کیا ادب کا زندگی، سماج، معاشرہ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہوسکتا تو پھر زندگی کے اس سنگین موڑ پر ان کا رول کیا ہے۔ خاص طور پر ترقی پسند ادیب سے۔ ہندی کے مشہور شاعر مکتی بودھ نے ایک بار سوال کیا تھا 'پارٹنر تمہاری پالی ٹکس کیا ہے؟' اسی طرح سوال ہے کامریڈ اس بحران میں آپ کا رول کیا ہے؟ کوئی مسلمانوں کے تہذیبی زوال پر خامہ فرسائی کر رہا ہے، کوئی لکھنوی اقدار پر ناول لکھ رہا ہے، کوئی غالب پر کتاب لکھ رہا ہے، کوئی منٹو پر، لیکن آج کے حالات پر کوئی بولنے کو تیار نہیں۔ کیا یہ فرار نہیں، کیا یہ احساس شکست نہیں؟

ادیب، دانشور صرف قلم کار نہیں ہوتا، اس کا تعلق صرف ادب سے بھی نہیں ہوتا، راست طور پر زندگی سے بھی ہوتا ہے۔ دانشوروں کا کام اپنی عقل و دانش سے تہذیب و اخلاق کے معیار طے کرنا، سماج اور زندگی کو مہذب بنانا اور دانشوری کے حوالے سے سیاست سمجھنا اور کرنا بھی، لیکن جب دانشوری ہی گندی سیاست سے اور گندے بازار میں ملوث ہوجائے، اقتدار کے قریب پہنچ جائے یا پہنچنے کی لالچ کرنے لگے تو وہ سب کام کرے گا لیکن دانشوری کا حق ادا نہیں کرے گا۔ اسی لیے، کچھ اقتدار پرست دانشور حکومت کا بھونپو بن جاتے ہیں اور پھٹے ڈھول پیٹتے رہتے ہیں اور جن کی رسائی نہیں ہو پاتی وہ حسرت و کوفت سے انھیں دیکھتے رہتے ہیں۔ کف افسوس ملتے رہتے ہیں۔ لالچ سے اعزاز، ایوارڈ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ کتابوں و رسالوں کے بجائے مادی آسائشوں کی فراہمی میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ کچھ کتابوں کا کاروبار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ زمین کا کچھ ضمیر کا۔ کچھ کا ضمیر ابھی بچا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انٹرنیٹ، فیس بک وغیرہ سے گھر میں بیٹھے بیٹھے وہ اس سیاست کی جنگ جیت لیں گے جب کہ گاندھی، نہرو، ظہیر، فیض، سردار وغیرہ نے سڑکوں اور جیلوں میں زندگی گزاری اور غیر معمولی دقتیں و اذیتیں برداشت کیں لیکن آج کے ترقی پسند دانشور لیڈر اے سی کمروں، ڈرائنگ روموں، کافی ہاؤسوں وغیرہ میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ عام انسان سے، عوام سے ان کے رشتے تقریباً کٹ گئے ہیں یا کاٹ دیے گئے ہیں اور انھوں نے بھی اپنے آپ کو لٹا ہوا یا ٹھگا ہوا مان لیا ہے اور احساس شکست سے مغلوب ہو کر ملک و معاشرہ، سماج و سیاست خوشی خوشی یا بہ مجبوری دوسروں کو سونپ دیا ہے اور خود محض تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ گھر جمائی بن کر اکادمیوں یا عدالتوں میں مصروف ہیں۔ ملک کدھر جا رہا ہے، عوام کو کس قدر گمراہ کیا جا رہا ہے، نفرت کا ننگا کھیل ہو رہا ہے، ہندوستان کی ہندوستانیت داؤں پر لگی ہوئی ہے اور ہم خاموش ہیں...اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ہماری حیثیت کیا ہے۔ ہماری آواز کہاں ہے۔ ہم کہاں ہیں۔ ایک ممتاز کنڑ ادیب نے کہا کہ اگر مودی وزیر اعظم بنے تو وہ ملک چھوڑ دیں گے۔ ان کے جذبے کی قدر کی جاسکتی ہے لیکن سوچیے کہ کروڑوں کی تعداد میں عوام کہاں جائے گی اُسے تو یہیں جینا مرنا ہے۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے زندگی کے آخری دنوں میں کہا تھا کہ میں نے عوام کے لیے کچھ نہیں چھوڑا سوائے اس احساس کے کہ میں ان کا آدمی ہوں۔ آج عام آدمی کا آدمی کون ہے۔ کون رہنما اور ہمدرد ہے۔ لوہیا کے شاگرد ملائم سنگھ یادو جو سماج واد سے زیادہ یادو واد اور پریوار واد پر یقین رکھتے ہیں۔ مایاوتی جو مخالفت و مخاصمت کی سیاست کرتی ہیں۔ منموہن سنگھ جو فراریت کی سیاست کرتے ہیں اور مودی جو نفرت اور فرقہ واریت کی سیاست کرتے ہیں بعض نام نہاد مسلم رہنمایان اور مولویان جو اقتدار کی چڑیا کے چکر لگاتے رہتے ہیں اور اس شمار میں پالے بدلتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند بائیں بازو کی جماعت کی سیاست خاموش، ساکت، احساس شکست میں سرشار یا شرمسار۔ آج کے ترقی پسند شاعر و ادیب کردار میں کم بازار میں زیادہ یقین رکھنے لگے ہیں۔ معلوم و محسوس سے کم مشروب پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ اب ایسے میں عوام کی فکر کون کرے، انسان کی انسانیت، حرمت کا خیال کسے۔ اقبال نے کہا تھا:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری

سیاست فسطائیت میں بدل چکی ہے۔ جمہوریت صارفیت میں۔ ہر طرح کا ننگا پن رسوا سر بازار ہے۔ یہی آج کے اقدار ہیں اور یہی افکار۔ ایسے میں عام انسانوں کی فکر کون کرے۔ اس ملک کی مشترکہ تہذیب و تاریخ کی حفاظت کون کرے۔ سیاست کچھ اور کہہ رہی ہے، تاریخ کچھ اور۔ جمہوریت کچھ اور۔ مایوسی کفر ہے۔ شاعرانہ خیال ہی سہی لیکن پھر بھی ہمیں یقین ہے:

اک کرن نور کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی
(اختر سعید خاں)

¤¤¤

ماضی کی یادیں

مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال

وشوا ناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا یوپی I-201303)

صحافتوں کے لاؤ لشکر میں، قلم کے پُرجوش معرکوں میں، نور و ایمان کے جزیروں میں، دیدہ و دل کی راہوں میں، عشق صادق اور ذوق جنوں کے ڈیروں میں، صوفیوں اور زاہدوں کی مجالس میں، درویشوں اور واعظوں کے حجروں میں، سرفروشوں اور مجاہدوں کے ٹھکانوں میں، فقیروں اور پیروں کے آستانوں میں، معرفت اور طہارت کی بستیوں میں، عاشقوں اور دلبروں کے کوچوں میں، خاقانوں کے قلعوں اور سلطانوں کے شبستانوں میں آپ قلم کی شمشیر، تیکھے الفاظ کے نشتر، عربی اور فارسی الفاظ کے خنجر آبدار، بھاری بھرکم قافیوں کے گرز لے کر بھی نکلیں تو مولانا ظفر علی خاں جیسا جاں باز صحیفہ نگار اور باغی شاعر نہیں ملے گا جس نے تن تنہا شعر و ادب کے تاجداروں اور شعر و سخن کے سپہ سالاروں کی گردنیں اپنے قلم کی ایک ہی جنبش سے کاٹ ڈالیں اور لشکر غنیم کو اپنی دانتوں تلے داب لیا۔

پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں کا مقابلہ شان سکندری رکھنے والے علامہ اقبال سے تھا۔ ایسا وقت بھی آیا جب مولانا عوام کے اور علامہ خواص کے ترجمان ہوگئے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں مولانا کی نظمیں ڈھولک پر گائی جاتی تھیں یا ٹکے پر انگوٹھی کی مدد سے دہرائی جاتی تھیں۔ اخبار 'زمیندار' کے جس شمارے کے صفحۂ اول پر اُن کی طویل نظم شائع ہوتی تھی وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا تھا اور صبح دس بجے کے بعد کوئی کاپی بازار میں دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل کے علاقے کے ناخواندہ عوام ایک آنہ میں اخبار خریدتے اور دو آنے اسے پڑھوا کر سننے میں صرف اس مقصد کے لیے کرتے تھے کہ آج مولانا ظفر علی خاں نے ملت کو کیا پیغام دیا ہے۔ ہر چوتھے پانچویں روز جلسۂ عام سے مخاطب ہوتے جس میں سامعین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم ہوتا تھا اور بعض اوقات بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ وہ جب بھی کوئی نئی تحریک شروع کرتے تھے تو ہزاروں کی تعداد میں نوجوان اس میں شمولیت کے لیے آمادہ ہوجاتے تھے۔ وہ جلوسوں کی رہنمائی کرتے تو فرنگی سرکار کے پسینے چھوٹ جاتے تھے کیوں کہ امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوجاتا تھا۔ مولانا کا انداز تخاطب پرجوش اور باغیانہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ اپنی فی البدیہہ منظوم تقریر سے حاضرین پر سحر سامری طاری کردیتے تھے اور سرکار انھیں گرفتار کرنے اور 'زمیندار' کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے پر مجبور ہوجاتی تھی۔ اخبار کا پریس سربمہر کردیا جاتا تھا۔ ڈیکلریشن منسوخ کرکے نئی ضمانت طلب کرلی جاتی تھی۔

احتجاجی جلسوں میں جوش و خروش اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ اگلی ضمانت کے لیے مطلوبہ رقم جمع کرنے کی غرض سے عوام اپنی جیبیں خالی کردیتے تھے۔ برقعہ پوش خواتین اپنے کانوں کی بالیاں اور ہاتھوں کی انگوٹھیاں اتار کر اسٹیج کے آگے بچھی ہوئی سفید چادر پر پھینک دیتی تھیں۔ ایک بار ایسا نظارہ دیکھنے کو ملا کہ غریب پردہ دار عورتوں نے اپنے شیر خوار بچے مولانا کے قدموں میں رکھ دیے اور کہا کہ جاؤ ظفر علی خاں انھیں انارکلی چوک میں نیلام کردو۔ مصر کے بازار میں حضرت یوسف تک کی بولی لگا دی گئی تو ہمارے یہ ننھے منے اُن کے آگے کیا چیز ہیں۔ ماحول پر سناٹا چھا گیا، چند لمحوں بعد یہ خاموشی نعرۂ حق سے ٹوٹی۔ اس زمانے میں پنجاب کے عوام بلا امتیاز مذہب و ملت تحریک استخلاص وطن میں بٹے ہوئے تھے۔ 'زمیندار' ایک نیشنلسٹ اخبار سمجھا جاتا تھا، غیر مسلموں کی کافی تعداد اس کی خریدار تھی۔ پنجاب کے عوام نے ان دنوں صرف ایک ہی منصوبہ بنا رکھا تھا اور وہ تھا برٹش حکومت سے نجات حاصل کرنا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شہید سردار بھگت سنگھ کی ارتھی کا جو عظیم جلوس لاہور میں نکالا گیا تھا اس کی قیادت مولانا ظفر علی خاں نے کی تھی۔ وہ

ان کی یاد میں فی البدیہہ نظم پڑھتے جا رہے تھے اور اہل مجلس زار و قطار رو رہے تھے۔ اس کے بعد جو تقریر ہوئی وہ اس میں واحد مقرر مولانا ہی تھے۔ ایک بیان کے مطابق ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ مولانا نے جب اپنی ماتمی نظم پڑھی تو پورے میدان میں آہ و زاری کا ماحول طاری تھا۔ بھگت سنگھ ہمارے پنجاب کا بیٹا اور پورے ہندوستان کا نورِ نظر بن گیا تھا۔ میری والدہ بتایا کرتی تھیں کہ اس رات پنجاب کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔

یہ تھا ظفر علی خاں کی ہر دلعزیزی کا عالم۔ ادھر علامہ اقبال کی شہرت اور مقبولیت انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں دیکھنے کو ملتی تھی جن میں نہ صرف لاہور کے شہری بلکہ دیگر شہروں سے آئے ہوئے ان گنت لوگ شرکت کرتے تھے اور علامہ کا کلام اشتیاق کے ساتھ سماعت کرتے تھے۔ دیگر اجتماعات میں بھی علامہ شامل ہوا کرتے تھے۔ 'جواب شکوہ' موچی دروازے کے باہر باغ میں پڑھی گئی۔ کربلا کے شہیدوں کا لہو بادشاہی مسجد میں سنائی گئی۔ نظموں کو ترنم سے پڑھنے کا رواج سب سے پہلے علامہ نے ہی اپنایا تھا۔ ان کی آواز میں مٹھاس اور لہجے میں گداز تھا، وہ موسیقی کے سروں سے بخوبی آشنا تھے اس لیے مجمع پر چھا جاتے تھے۔ اقبال کی شخصیت پرکشش تھی، شعر خوانی کے دوران کئی بار شدتِ جذبات سے ان کے سرخ و سپید چہرے پر آنسو تیرنے لگتے تھے اور آواز میں زیادہ سوز پیدا ہو جاتا تھا۔ سامعین بھی علامہ کے سوز میں شامل ہو جاتے اور جلسے میں آہ و بکا کا عالم پیدا ہو جاتا تھا۔ لاریب کہ وہ اسلامی رنگ میں سخن گوئی کرنے لگے تھے لیکن ترانۂ ہندی کی بنا پر ان کا امیج قومی شاعر کے طور پر برقرار تھا۔ لاہور کے کالجوں میں پڑھنے والے ہزاروں نوجوان ہندو اور سکھ طلبہ اردو زبان سے اپنے لگاؤ کے باعث ان کے مداح تھے۔ وہ ان پر کسی ایک فرقے کا شاعر ہونے کا لیبل چسپاں کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ وہ ان کے مجموعہ ہائے کلام کا بصد شوق مطالعہ کرتے تھے۔ ہر کالج میں بزم ادب قائم تھی اور ہر میٹنگ میں ان کے اشعار بطور تبرک پڑھے جاتے تھے۔ پنجاب ہندو سبھا کے صدر اور لاہور شہر کی ممتاز شخصیت ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ ایڈووکیٹ اقبال کے بہترین دوستوں میں سے تھے کیوں کہ وہ خود بھی شاعر تھے۔ دونوں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے اور اجلاس کے دوران بعض نکتوں پر ان کے مابین دل چسپ شاعرانہ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ تقسیم وطن سے ایک دو سال قبل گوکل چند نارنگ کا اردو مجموعۂ کلام طبع ہوا تھا جو میں نے خود دیکھا تھا اور شاید اب بھی ان کے کسی دوست کے گھر میں موجود ہو۔ پنجاب کے پرانے اردو نواز ہندو سکھ بزرگوں کو یاد ہوگا کہ نارنگ صاحب کی شاندار کوٹھی پر جب بھی شعر و شاعری کی محفل منعقد ہوتی تھی تو اقبال خاص مہمان ہوا کرتے تھے۔ سیاسی مصلحتیں تھیں کہ ہندو مہا سبھا کے بڑے رہنما ہونے کے باعث پبلک پلیٹ فارموں پر وہ اردو کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ ان تضادات کے باوجود بھی مذاہب کے لوگ مل جل کر رہا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ یہ سب اردو کے سیکولر کردار کا اعجاز تھا جس نے گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کو جنم دیا تھا۔

وفات سے کچھ عرصہ پہلے شاعرِ مشرق کی آواز بیٹھ گئی تھی جو ایلوپیتھی علاج سے ٹھیک نہ ہوئی۔ لاہور کے مشہور حکیم فقیر محمد چشتی باکمال شاعر ہونے کے ناطے لاہور کے ادبی حلقوں میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ وہ چھووالی میں آریہ سماج مندر کے ایک کرایے کے بالا خانے میں مطب کرتے تھے، ہم ذوق ہونے کے باعث مولانا عبدالمجید سالک کے گہرے دوست تھے۔ قدرت نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا دی تھی۔ انھوں نے سر سکندر حیات خاں (وزیر اعلا پنجاب) کے گردے کے متورم کا کامیاب علاج کیا تھا جب کہ لاہور کے سب بڑے ڈاکٹر ناکام ہو گئے تھے۔ انھوں نے ایک ۱۹ سالہ لڑکی کا عجیب و غریب طریقے سے علاج کر کے بڑی شہرت کمائی تھی جو ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہو کر اندھی ہو گئی تھی مگر حکیم فقیر محمد چشتی کے یونانی علاج سے اس کی بینائی بحال ہو گئی تھی۔ مولانا سالک کے کہنے پر علامہ اقبال نے حکیم صاحب سے علاج کرایا مگر ٹھیک نہ ہو سکے۔ ان کی صحت مسلسل گرتی چلی گئی۔ وہ اس لیے بڑے مایوس ہوئے کہ حج کرنے کی اپنی دیرینہ مقدس آرزو کو پورا نہ کر سکے۔ انھوں نے علالت کے دوران اپنے تصور میں ہی حجاز کا سفر کیا اور اپنے پاکیزہ تاثرات ارمغان حجاز میں بحسن و خوبی بیان کر دیے۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد طبع ہوئی۔

بات بہت پرانی اور بڑی دل چسپ ہے، جو مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر اقبال کے ابتدائی دنوں کی دوستی کی یاد دلاتی ہے۔ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے، اقبال کو اچھی نسل کے کبوتر پالنے کا شوق تھا، دیگر کئی اردو شعرا کی طرح انھوں نے کئی کبوتر جمع کر رکھے تھے جن سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک کبوتر ایسا تھا جو بام حرم مدینہ کے کبوتروں کی نسل سے تھا اور یہ علامہ کو بہت عزیز تھا۔ ایک بلی کے پنجہ مارنے سے وہ بری طرح زخمی ہو کر چل بسا۔ اس کی رحلت سے وہ بہت مغموم ہوئے اور کئی روز تک افسردہ رہے۔ مولانا ظفر علی خاں کو ان کے غمگین ہونے کا علم ہوا تو وہ بھی بڑے دکھی ہوئے اور کبوتر کا مرثیہ لکھ کر اپنے خط بردار ملازم یامین کے ہاتھ علامہ کی خدمت عالیہ میں ارسال کیا:

رخصت ہو تیری جان پہ اے مرغ حرم پر
آیا تھا ناز کے ذرۂ بام حرم سے تو
انداز جبرئیل تھا تیری اڑان میں
کرتا نہ کیوں صعود گہ پیر اقدم سے تو
زمزم میں تر ہوئی تیری منقار نغمہ ریز
کرتا رہا عرب کو نمایاں عجم سے تو
جاں کو بسا دیا تھا شمیم حجاز میں
دیا تھا تار توڑ کے زلف صنم سے تو
ہم کو دیا پیام الف لام میم کا
ناآشنا نہ تھا وہ رموز الم سے تو
نفرت تھی آشیانۂ ہستی سے تجھ کو کیوں؟
آیا نظر کے عازم کاخ عدم سے تو
تجھ پر ادھر وہ بھی قرباں ہوں کہ تھا
وابستگان دامن شاہ امم سے تو

ظفر علی خاں اور اقبال کی چپقلش صرف اخبارات تک محدود تھی اور کبھی کبھی پبلک جلسوں میں اس کا اعادہ کیا جاتا تھا جہاں دونوں گروپوں کے حامی دلوں کا غبار نکالتے تھے۔ اس کشمکش کا کوئی اثر مولانا اور علامہ پر نہیں تھا نظریاتی اختلافات کے باوجود دونوں باہم رشتے تھے اور دلوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایک دوسرے کے احترام میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ظفر علی خاں کی شوکت و رفعت، تمکنت و عظمت اپنی جگہ قائم تھی۔ سید سلیمان ندوی نے یہ کہہ کر ان کا مرتبہ اور بھی بلند کر دیا تھا کہ "اردو ادب نے تین کامل الفن اساتذہ پیدا کیے ہیں، محمد رفیع سودا، اکبر الہ آبادی اور ظفر علی خاں"۔

ظفر علی خاں اپنے مخالفین سے چہار سو معرکہ آرائی کرتے تھے، وہ قلم سے سیف کا کام لیتے اور ان کا جہاد ہر دم جاری رہتا تھا تھکنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ پنجاب کے مختلف اخبارات سے وابستہ شعرائے خاص ان سے نوک جھونک کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ عبدالمجید سالک کا مشاہیر سے بھرپور طائفہ گاہے گاہے ان سے ٹکر لیتا مگر ظفر علی خاں کے حریف ان پر ابابیل کی کنکریوں کی طرح گرتے اور وہ چت ہو کر مرغ بسمل کی مانند پھڑپھڑانے لگتے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب بھی مولانا بیمار پڑتے اور ان کی صحت زیادہ خراب ہو جاتی، مخالفین خالق ازل کے دربار میں سربسجود ہو کر ان کی شفائے عاجلہ اور صحت کاملہ کی دعائیں مانگتے کیوں کہ ان کی شہرت اور مقبولیت کا دارومدار بابائے صحافت کی شکایات پر تھا۔ اخبارات کے مدیران کی کانفرنسوں میں جب آمنا سامنا ہوتا ظفر علی خاں ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے یا پیٹھ تھپتھپا کر شاباشی دیتے۔

حالات نے پلٹا کھایا، یوں تو ظفر علی خاں ۱۹۳۵ء میں ہی کانگریس سے کچھ کچھ رہنے لگے تھے مگر رفاقت کا بھرم قائم تھا۔ ۱۹۳۷ء تک نیشنلسٹ جماعتوں کے ساتھ رہے، ۱۹۳۹ء میں دو قومی نظریہ کا راگ الاپنے لگے، اگلے سال باقاعدہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر تقسیم وطن کے حامی بن گئے، نوک قلم سے فرقہ وارانہ منافرت کا زہر اگلنا شروع کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مدیران 'انقلاب' مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے آگ میں تیل ڈالنے کا کام نہیں کیا۔ خیالات میں قدرے تبدیلی کے باوجود انھوں نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ روزنامہ 'احسان' کٹر لیگی صحیفہ تھا مگر اس کے مالک ملک نور الٰہی کے غیر مسلم صحافیوں سے دوستانہ روابط تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈیٹر کو ہدایت دی کہ وہ لکھتے ہوئے اعتدال سے کام لے۔ روزنامہ 'سیاست' جو کہ نیشنلسٹ اخبار تھا پہلے ہی انگریز گورنر کے حکم کے باعث بند ہو چکا تھا۔ اس کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام نہ ہو سکا کیوں کہ اس کے مالک اور ایڈیٹر اپنی ہی قوم کے قہر و غضب کا شکار تھے۔ 'زمیندار' کو کھل کھیلنے اور اشاعت بڑھانے کا موقع ملا اور اس نے اشتعال انگیزی کی حد کر دی۔ اس کے ایڈیٹر اختر امرتسری ذہناً احراری تھے اور بنیادی طور پر نیشنلسٹ تھے مگر اپنے مالک ظفر علی خاں کی اطاعت پر مجبور تھے۔ 'زمیندار' نے کسی کو نہیں بخشا، وطن پرور مسلم رہنماؤں کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا۔ ان پر بہتان لگائے گئے اور تہمتیں تراشی گئیں۔ انھیں اس قدر برا بھلا کہا کہ ان کا سڑکوں پر آنا محال ہو گیا، اس ماحول میں ان کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ انھیں فحش گالیاں دی گئیں اور وہ بری طرح لیگیوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ لوگ حیران تھے کہ امن و آشتی کے علمبردار بابائے صحافت کے سر پر یہ جنون کیوں سوار ہو گیا ہے کہ وہ منافرت اور حقارت کی ہانگی دینے لگے ہیں۔ ایسا ہی رویہ کچھ جنون انگیز ہندو اخبارات نے اختیار کیا، حالات کو بدتر بنانے اور ماحول کو پراگندہ کرنے میں انھوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پورے پنجاب کو جہنم بنا دیا گیا۔ پنجابیوں کا پیارا شہر لاہور ان کی آنکھوں کے سامنے جل رہا تھا۔ انگریزوں کی پالیسی رنگ لا رہی تھی۔ پنجاب کا روایتی امن و سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ آسمان رو رہا تھا اور خدا دیکھ رہا تھا۔

●●●

اردو دُنیا

طلبہ کی کثیر تعداد کے باوجود اردو اساتذہ مہیا نہیں

وضاحت کے لیے دہلی کے ایجوکیشن ڈائرکٹر کو کمیشن میں طلب کیا گیا: جسٹس صدیقی

نئی دہلی (۱۰ مئی)۔ دہلی کے سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی کثیر تعداد موجود ہونے کے باوجود انھیں اساتذہ مہیا نہ کرائے جانے پر جواب طلب کرنے کے لیے قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات نے دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹر کو کمیشن میں طلب کیا ہے۔

قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے خصوصی بات چیت میں بتایا کہ دہلی کے دو اسکولوں کے بارے میں ان کے پاس یہ شکایت آئی ہے کہ وہاں اچھی خاصی تعداد میں اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ موجود ہیں لیکن اسکول میں اردو اساتذہ مہیا نہیں کرائے جارہے ہیں جس پر ان طلبہ کے والدین نے بھی کمیشن میں شکایت کی ہے۔ جسٹس صدیقی نے بتایا کہ دہلی کے ایجوکیشن ڈائرکٹر کو اس سلسلے میں کمیشن میں حاضر ہوکر صورت حال سے واقف کرانے کو کہا گیا ہے۔

جسٹس صدیقی نے کہا کہ کمیشن ۲۰۰۴ء سے ہی دہلی کے اسکولوں میں اردو اور پنجابی کے اساتذہ کی فراہمی کے تعلق سے کافی سنجیدہ رہا ہے اور اس سلسلے میں اس نے ان زبانوں کی اکادمیوں اور محکمہ تعلیم سے مسلسل رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ جب اردو اکادمی نے کمیشن کو جواب بھیجا کہ ان کے پاس اردو اساتذہ نہیں ہیں اور انھیں مزید اساتذہ کے تقرر کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد کمیشن نے دہلی سرکار اور محکمہ تعلیم پر اس سلسلے میں قدم اٹھانے کا دباؤ ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ آر آر (رکروٹمنٹ رولس) نہ ہونے کے سبب اردو اساتذہ کی بحالی کے جس عمل کو روک دیا گیا تھا کمیشن اس کو پھر سے شروع کرنے کے لیے محکمہ تعلیم کو ہدایت دے گا۔ انھوں نے کہا کہ لازمی تعلیمی ایکٹ کے تحت طلبہ کو تمام سہولت مہیا کرانا حکومت کی ذمہ داری ہے جس میں نئے اسکول اور اساتذہ کی بحالی بھی شامل ہے۔ انھوں نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ دہلی کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی بحالی کے لیے عدالت سے احکام جاری ہونے کے باوجود کچھ افسران متعصبانہ رویہ اختیار کررہے ہیں اور اردو اساتذہ کی بحالی کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام لیا جارہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ٹی ای ٹی امتحان اردو میں بھی منعقد کرنے کا مطالبہ

بیدر، کرناٹک (۲۸ اپریل)۔ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس ایسوسی ایشن کرناٹک کے ریاستی صدر محمد نظام الدین اور سکریٹری ایم اے رانوی اور دیگر اساتذہ نے حکومت کرناٹک کی وزارت تعلیم اور دیگر متعلقہ محکموں کو ایک اہم نکتے پر توجہ مبذول کراتے ہوئے اپنی یادداشت میں کہا ہے کہ کرناٹک میں پہلی مرتبہ ٹیچرس کے تقرر کے لیے مقابلہ جاتی امتحان کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ امتحان صرف دو زبانوں میں ہی منعقد کیا جائے گا۔ کنڑا اور انگلش میں امتحان کے لزوم پر آئیٹا کے مذکورہ عہدے داروں نے کہا ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ ان دو زبانوں کے علاوہ اردو کو بھی شامل کرے کیوں کہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں زبان اردو سے جن طلبہ نے بی ایڈ اور ڈی ایڈ کا کورس مکمل کیا ہے، ان کے لیے مذکورہ قانون کے تحت کافی مشکلات درپیش ہیں کیوں کہ جو امیدوار زبان اردو سے مذکورہ کورس مکمل کرچکے ہیں ان کو اب انگریزی اور کنڑا میں امتحان دینے میں کافی دشواریاں پیدا ہوں گی جس کے نتیجے میں کئی طلبہ تقرر سے محروم ہوسکتے ہیں، لہٰذا آئیٹا چاہتی ہے کہ حکومت اس بارے میں غور کرے اور جو طلبہ اردو میڈیم سے کورس مکمل کرچکے ہیں ان کو ٹی ای ٹی امتحان اردو میں تحریر کرنے کی سہولت فراہم کرے۔ حکومت کو چاہیے کہ اس ضمن میں فوری اقدام کرتے ہوئے امتحان کو اردو میں دینے کے لیے احکام جاری کرے۔

(سالار۔ بنگلور)

تلنگانہ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دینے کا عزم

کریم نگر۔ مرکزی وزیر جے رام رمیش صاحب نے کہا کہ علاحدہ ریاست تلنگانہ میں مسلمانوں کے تحفظات کو قانونی شکل دینے کے اقدام کیے جائیں گے نیز نئی ریاست کے تمام اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے عملی اقدام بھی کیے جائیں گے۔

(صدائے اردو۔ بھوپال)

اردو کے ساتھ سوتیلے سلوک کا الزام

سنت کبیر نگر۔ اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے، اس کی ترقی میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دیگر برادران وطن بھی برابر کے شریک اور حصے دار ہیں لیکن افسوس آج اس زبان سے تعصب برتنے اور حقیر سوچ رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ اسی سوچ کو بروئے کار لاتے ہوئے انتخابی کمیشن نے اس بار ای وی ایم مشین پر امیدواروں کے نام اور ان کے نشان کو صرف ہندی زبان میں تحریر کیا اور اردو زبان کو غائب کردیا ہے جس کو لے کر اردو داں طبقے میں ناراضگی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ثناء اللہ ایوبی کا کہنا ہے کہ آج جس طرح اردو زبان کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے، اس کی تازہ مثال انتخابی کمیشن کا ای وی ایم مشین سے اردو کا غائب کرنا بھی ہے۔

اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ

حیدرآباد (۲۳ اپریل)۔ صنعت نگر حلقہ اسمبلی کی امیدوار ہیبا پراوین نے تشہیری مہم کے دوران اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہیبا پراوین کا کہنا ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں بنیادی سہولتیں فراہم کرکے اردو طلبہ میں ترک تعلیم کے رجحان میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اسمبلی کے مختلف علاقوں کا دورہ کرکے عوامی مسائل سے واقفیت حاصل کی۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

نیم پلیٹ پر ہندی کے ساتھ اردو بھی درج کریں

ماہانہ کرائم میٹنگ میں ایس ڈی پی او محمد قاسم کی پولیس افسران کو ہدایت

کشن گنج، بہار (۹ مئی)۔ پولیس افسران اب نیم پلیٹ پر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی نام درج کرائیں۔ ماہانہ کرائم میٹنگ میں ایس ڈی پی او محمد قاسم نے آج ضلع کے سبھی پولیس انسپکٹر، تھانہ انچارج کو واضح ہدایت دی اور کہا کہ بلا تاخیر ہندی اور اردو میں درج نیم پلیٹ کا استعمال کریں۔ ایس ڈی پی او نے خود اعتمادی سے لبریز ہوتے ہوئے سبھی تھانہ انچارجوں کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ پولیس افسران ہمیشہ مستعد ہیں اور رہیں گے بھی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

بزم اردو جودھپور اور سروکار کے زیر اہتمام ادبی جلسہ

جودھپور (پریس ریلیز)۔ عادل رضا منصوری نے شاعری میں اپنے وقت کے اظہار کے ساتھ اسالیب کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے یہاں عشق حقیقی میں عشق مجازی مدغم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد جناب شین کاف نظام نے سروکار اور بزم اردو جودھپور کے زیر اہتمام جے پور کے نوجوان شاعر اور انتشار کے مدیر عادل رضا منصوری کے واحد شاعر پروگرام میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ عادل نے اپنے آس پاس کی روایت کو توڑا ہے اور اشاروں کو غزل میں اہمیت دی ہے اس لیے ان کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ پروگرام کے صدر راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے ڈی راہی نے کہا کہ عادل نے اپنے اشعار سے متاثر کیا ہے۔ اس موقع پر عادل نے ہم کو مطلب ہے ان کے آنے سے، دن کسی آسمان سے نکلے، ہر اک دستار خونی پر تھی ہے، کسی کاندھے پہ کوئی سر نہیں ہے، یہ جو نقشہ نیا آسمانوں کا ہے، کیا کرشمہ ہماری اڑانوں کا ہے وغیرہ غزلیں اور سوکھا ہوا جنگل، شام، جاڑہ موسم، پہنے کا غم، آبا، کھنڈر وغیرہ نظمیں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

پروگرام کے آغاز میں بزم کے صدر نے استقبالیہ تقریر کی۔ ڈاکٹر نثار راہی نے 'قدیم قامت پر نیا چہرہ اگانے کی ذہنی' عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ عادل کی غزلوں سے گزرتے ہوئے ہر جا جہاں دیگر نہ کسی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک ایسی دنیا کا دیدار ہوتا ہے جس میں نئے پیکر، تشبیہات، استعاروں کے علاوہ محاورے کا نیا انداز جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے چند الفاظ کے معنی کو وسعت بھی عطا کی ہے۔ پروگرام میں ہندی، اردو اور راجستھانی زبانوں کے ادیب اور معزز افراد موجود تھے۔ نظامت کے فرائض اشراق الاسلام ماہر نے انجام دیے۔

قلعہ گولکنڈہ میں نئے بورڈس نصب لیکن اردو نظر انداز

حیدرآباد (۵ مئی)۔ اردو دوسری سرکاری زبان پر عمل آوری اور اس کی ترقی کے تعلق سے حکومت کے وعدے اور اعلانات اہل زبان کو خوش کرنے کی ایک ناکام کوشش ثابت ہورہی ہے کیوں کہ حکومت کے ان اعلانات اور ہدایات کے باوجود سرکاری عہدیداروں کی اردو سے دشمنی وقتاً فوقتاً ظاہر ہورہی ہے۔ اردو کے شہر میں اردو کو مٹانے کی مذموم سازش کے آئے دن ثبوت ملتے ہیں۔ دوسری سرکاری زبان اردو کو پولیس اسٹیشنوں، دواخانوں، بسوں اور بس اسٹاپس، ریلوے اسٹیشن اور دیگر اہم عوامی مقامات پر سے پہلے ہی ختم کردیا گیا۔ اردو زبان و ادب کا گہوارہ اور پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق شہر حیدرآباد سے ہے اور اب شہر حیدرآباد سے ہی اردو کو ختم کرنے کی سازش ہورہی ہے کیوں کہ قلعہ گولکنڈہ کے باب الداخلہ سے ۴۸۰ فٹ بلندی پر موجود عوام کی رہنمائی اور ہر مقام کی تفصیلات پر مشتمل بورڈ پر اردو کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت کے زیر انتظام گولکنڈہ قلعے میں باب الداخلہ سے لے کر بالا حصار تک ہر مقام اور میدان کی تفصیلات فراہم کرنے اور عوام کو معلومات دینے کے لیے شاندار گرانائیٹ پتھروں پر مقامات کی تفصیلات تلگو، ہندی اور انگریزی میں موجود ہیں لیکن ان پتھروں کے سائن بورڈس سے اردو کو یکسر غائب کردیا گیا ہے۔ حد تو یہاں تک ہوچکی ہے کہ قلعہ گولکنڈہ میں جو پانچ مساجد ہیں ان کے نام بھی صرف تلگو، ہندی اور انگریزی میں ہی درج ہیں۔ ان میں ابراہیم مسجد، تارہ متی مسجد، جھٹکی مسجد، موتی مسجد اور زنانی مسجد کے علاوہ دربار ہال، نگینہ باغ کو بھی تلگو

یوم اردو (Urdu Day)

اقبال کے بعض عقیدت مندوں کا ان کے یوم ولادت کو یوم اردو منانا محبوب و مسعود تو ہے لیکن معقول نہیں۔ معقول اور مقبول بات تو یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے یوم وفات (۲۷ مئی) کو یوم اردو منایا جائے کیوں کہ نہرو کو دیہاتی اور بچے تک جانتے ہیں جب کہ اقبال کو آج صرف اردو میڈیم کے طلبا ہی جانتے ہیں (اور وہ تقریباً مسلم ہی ہوتے ہیں) اور اردو چوں کہ جواہر لال نہرو کے خاندان کی مادری زبان تھی اس لیے اردو دشمن بھی اس کی مخالفت کی ہمت نہیں کریں گے۔ ہم کو تو آم سے مطلب ہے نا!
(۲۷ مئی کو خصوصی اسٹامپ کے لیے محکمۂ ڈاک سے مطالبہ بھی کرنا چاہیے!)

ابن غوری
مکان نمبر 11-3-948، امتیاز ریزیڈنسی مقابل امبا ہاسپٹل، بنڈے پلی
حیدرآباد، آندھرا پردیش

لب و لہجے اور تلفظ میں تبدیل کر دیا گیا ہے جب کہ ابراہیم مسجد کو ناسخ آف ابراہیم لکھ دیا گیا ہے، جب کہ محکمۂ آثار قدیمہ کی غفلت اور نئے بورڈس پر تلگو، ہندی اور انگریزی تحریر ہونے اور اردو کو ہٹانے سے متعلق یہاں کے ذمہ دار اور اعلا عہدیدار سے استفسار کیا گیا تو پہلے تو اس عہدیدار نے کسی بھی سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں دیا، پھر دوسرے اس کی تمام گفتگو صرف تلگو زبان میں ہی تھی حالاں کہ بار بار اس عہدیدار کو اردو کی طرف راغب کرنے کے لیے اردو میں سوال کیے گئے لیکن وہ صرف تلگو میں ہی جواب دے رہا تھا۔ یاد رہے کہ ایک وہ زمانہ بھی تھا جب اردو صرف مسلمانوں کی یا مساجد، درگاہوں اور خانقاہوں کی زبان نہیں تھی بلکہ کبھی مندر میں بھی اردو ہوا کرتی تھی۔ پرانے پل کے شمشان گھاٹ کی قدیم تختی اور دھول پیٹ کے ایک مندر میں بھی اردو کی تختی آج بھی موجود ہے۔ اردو کو مٹانے کی سازش میں جہاں غیر اپنا متعصبانہ رویہ اختیار کر رہے ہیں تو اس میں ہم اردو والوں کا بھی رول مجرمانہ غفلت کا ترجمان ہے کیوں کہ اردو کو ختم کرنے والی سازشوں کو کھلی آنکھ سے دیکھنے کے بعد بھی ہم اپنے طور پر کوئی بھی اقدام نہیں کرتے اور نہ ہی قانونی راہ اختیار کرتے ہیں۔

(سیاست، حیدرآباد)

ڈی ڈی اردو سے خبروں کی پٹی کے ہٹائے جانے کا کوئی جواز نہیں

نئی دہلی (۱۷ مئی)۔ مولانا وحید الحق ایجوکیشنل ٹرسٹ کے ادبی ونگ کے صدر ڈاکٹر انوار الحق نے ایک پریس بیان جاری کر کے کہا کہ ڈی ڈی اردو سے خبروں کی پٹی ہٹانے کا کوئی جواز نہیں۔ ڈی ڈی اردو کی مقبولیت کچھ لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ اس چینل کی مقبولیت سے بوکھلائے ہوئے لوگ طرح طرح کی سازشیں کر کے اس پیش رفت کی مخالفت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ڈی ڈی اردو پر خبروں کے اسکرول کا چلنا محض ایک رسم یا روایت کی پیروی نہیں تھی بلکہ اس سے اردو اسکرپٹ کی ہندوستانی ٹیلی ویژن پر موجودگی درج ہوتی تھی۔ اردو رسم الخط اردو کی جان ہے اور اس کا ہندوستان کے پُر وقار چینل ڈی ڈی اردو سے غائب ہونا ایک سازش معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چوطرفہ مذمت اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے اردو کے شیدائی اس حرکت کو یوں ہی برداشت نہیں کریں گے۔ سرکار کو ڈی ڈی اردو کے اسکرول کو پھر سے بحال کرنا ہوگا۔ یہ معاملہ صرف ایک چینل کا نہیں بلکہ اردو رسم الخط کی ٹیلی ویژن پر موجودگی اور اردو کے تئیں سرکار کی اور ڈی ڈی اردو میں کام کر رہے عملے کی نیت کا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

غالب انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کا غالب توسیعی خطبہ

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۸ مئی کو 'غالب توسیعی خطبہ' کے موقعے پر ممتاز ادیب اور دانش ور اور ماہر غالبیات پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے 'غالب کے غیر متداول دیوان' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب کا غیر متداول دیوان ایک عرصے سے لوگوں کی توجہ کا اس طرح مرکز نہیں ہے جیسے اُسے ہونا چاہیے۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے یہ سوالات بھی اٹھائے کہ غیر متداول دیوان میں جو کلام موجود ہے اور جس کے بارے میں غالب نے یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس کلام کو مسترد کر دیا تھا، وہ مسترد کلام اصلاً کس کا رد کیا ہوا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ غالب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں مشکل گوئی ترک کر دی اور میر کا انداز اختیار کر لیا یہ بات بھی سراسر غلط ہے کیوں کہ غالب کا تمام معروف اور مشہور کلام اُن کے ابتدائی زمانے کا کہا ہوا ہے۔ اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ فاروقی صاحب اس عہد کے بڑے ماہر غالبیات ہیں۔ غالب پر انھوں نے جو کچھ تحریر کیا اُسے علمی و ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ ان کی کتاب 'تفہیم غالب' غالب فہمی میں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے یہ بھی کہا کہ غالب کے غیر متداول دیوان پر جو بھی گفتگو ہوگی اس سے یقیناً غالب تحقیق و تنقید میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے معروف غالب شناس ڈاکٹر خلیق انجم نے پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے عالمانہ خطبے پر انھیں مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ غالب کے غیر متداول دیوان کے تعلق سے اردو اور فارسی کے ادیبوں کے ذہنوں میں جو شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں ہیں، ان کے اس خطبے کے بعد ختم ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے علمی و ادبی مرتبے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب خصوصاً غالبیات کے حوالے سے آپ کی کاوشوں کو اردو دنیا میں ہمیشہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے جلسے کی نظامت کرتے ہوئے غالب توسیعی خطبے کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ غالب توسیعی خطبہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایک اہم پہچان ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے کئی بڑے ادیبوں نے غالب توسیعی خطبہ پیش کیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی ایک ایسے موضوع پر خطبہ پیش کر رہے ہیں جس پر کم گفتگو ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے اس خطبے سے غالب کے غیر متداول کلام کی اہمیت کو بھی ہم سمجھ سکتے ہیں۔ جناب شاہد ماہلی نے پروفیسر شمس الرحمن فاروقی اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے خطبے سے ہمارے علم میں اضافہ ہوا اور ادارے کا وقار بھی بڑھا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کی اہم کتاب 'تفہیم غالب' کے تیسرے ایڈیشن کی رسم رونمائی بھی ہوئی۔ جلسے میں امریکہ کے اہم ڈاکٹر اور اردو کے ادیب جناب سید احمد حسن بھی موجود تھے جنھیں غالب انسٹی ٹیوٹ کی کتابوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر ریاض الدین علوی، پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر اطہر فاروقی، اے رحمان، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر شعیب رضا خاں، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر نشاں زیدی، ڈاکٹر جاوید رحمانی، ڈاکٹر ادریس احمد، ڈاکٹر سہیل انور اور مسعود فاروقی کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم موجود تھے۔

اردو اساتذہ کی تقرری میں دہلی سرکار کا محکمۂ تعلیم غیر سنجیدہ

نئی دہلی (کم مئی)۔ اپریل ماہ میں نیا تعلیمی سیشن شروع ہو چکا ہے۔ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے اور طلبا کو سہولتیں مہیا کرانے کی متعدد اسکیموں کے نفاذ کے باوجود طلبا کو اساتذہ جیسی بنیادی چیز سے محروم رکھا جا رہا ہے، خاص طور سے اردو کے ساتھ محکمۂ تعلیم کا سوتیلا رویہ برقرار ہے۔ راجدھانی میں اردو میڈیم سرکاری اسکولوں کے طلبا ہندی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجبور ہیں اور محکمۂ تعلیم اردو اساتذہ کی تقرریوں کے تعلق سے سنجیدہ نہیں ہے۔ دہلی اسمبلی الیکشن کے لیے انتخابی ضابطۂ اخلاق نافذ ہو جانے کے سبب اردو اساتذہ کی تقرری کا عمل اب تک دوبارہ شروع نہیں ہوا ہے۔ راجدھانی کے سرکاری اسکولوں میں اردو میڈیم کے اساتذہ کی برسوں سے کمی ہے۔ محکمۂ تعلیم کا دھیان اساتذہ کی کمی کی جانب دلائے جانے کے باوجود دہلی سرکار کے محکمۂ تعلیم کی نیند نہیں ٹوٹی ہے۔ اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات ہندی میڈیم کے اساتذہ سے پڑھنے پر مجبور ہیں جو انھیں پڑھانے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ مجبور ہو کر ایک بار پھر اردو داں طبقے کو اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ عدالت کا فیصلہ آنے میں تو وقت لگے گا۔ اب جب تک عدالت کا فیصلہ نہیں آ جاتا اور دہلی سرکار کے محکمۂ تعلیم کو واضح حکم نہیں دے دیتا اب تک ان طلبا کے لیے کیا قدم اٹھایا جائے جو دسویں اور بارہویں جماعت کے طالب علم ہیں اور انھیں بورڈ کے امتحان میں بیٹھنا ہے۔ اس سلسلے میں دہلی کا اردو داں طبقہ لیفٹننٹ گورنر نجیب جنگ کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے کئی سال سے قانونی لڑائی لڑ رہے ڈاکٹر زین العابدین نے کہا کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ملک کے حکمراں اور افسران ایک منصوبہ بند سازش کے تحت اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی زبان کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ دہلی میں کئی اردو

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

ٹیچرس ایلیجبلٹی ٹسٹ اردو میں بھی منعقد کرنے کا مطالبہ

بیجاپور، کرناٹک (۲۷ اپریل)۔ بیجاپور کے رکن اسمبلی ڈاکٹر مقبول باگوان نے ریاستی وزیر اعلا سے مطالبہ کیا ہے کہ ٹیچرس ایلیجبلٹی ٹسٹ (ٹی ای ٹی) اردو میں بھی منعقد کیا جائے۔ ڈاکٹر باگوان نے ریاستی وزیر اعلا سدا رامیا کے نام مکتوب میں کہا ہے کہ ریاست میں کنڑا کے بعد سب سے زیادہ سرکاری و غیر سرکاری پرائمری اور سیکنڈری اسکولس اردو میڈیم میں کام کر رہے ہیں۔ ریاست میں بہت ساری اردو کی پوسٹیں خالی ہیں۔ امسال سے کرناٹک میں رائج ٹی ای ٹی کے ذریعے بہترین ٹیچرس کے انتخاب کا امکان ظاہر کیا جا رہا ہے مگر ٹی ای ٹی اردو میں منعقد نہیں کیے جانے کے سبب اردو ٹیچرس کا تقرر اطمینان بخش نہیں ہو پائے گا کیوں کہ اردو ذریعہ تعلیم سے فارغ طلبا کو کنڑا اور انگریزی زبانوں پر عبور نہیں ہوتا۔ ڈی ایڈ مکمل کرنے کے باوجود ایلیجبلٹی امتحان میں وہ توقع کے مطابق نتیجہ نہیں لا سکیں گے۔ ڈاکٹر باگوان نے وزیر اعلا پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ نیشنل کونسل فار ٹیچرس ایجوکیشن کی سفارش پر ریاست میں عمل میں لایا گیا ہے اس لیے فوراً این سی ٹی ای سے رابطہ قائم کر کے اگر ٹی ای ٹی اردو میں بھی منعقد کرانے کے لیے راہ ہموار کریں گے تو اردو والے آپ کے مشکور ہوں گے۔ جمعیت علمائے ہند ضلع بیجاپور نے بھی ایک پریس نوٹ میں ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ٹی ای ٹی اردو میں بھی منعقد کیا جائے۔

(سالار، بنگلور)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مضطراب سخن
مصنف : شوکت پرویسی
تصحیح و تہذیب : ڈاکٹر تابش مہدی
ضخامت : ۱۴۴ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : شمیم احمد وسیم احمد
۱۵۴ نودھا نگر نولا بیتاشیش
باب شاہی محلہ) جونپور، یوپی
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

جونپور کی سرزمین ہر دور میں علم و ادب کے اعتبار سے سرسبز و شاداب رہی ہے جہاں سے حفیظ و شفیق جیسی شخصیات نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا ہے، یہاں کے ادبا و شعرا نے اپنی تابناکی سے جہان علم و ادب کو منور کیا ہے۔ محمد عرفان معروف بہ شوکت پرویسی بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شاعری رومانی ماحول میں انسان کے داخلی کرب کے اظہار کی شاعری ہے، ان کی نظموں میں قدم قدم پر لاتعداد مسائل سے جوجھتے ہوئے انسان کی بے چینی، مضطرب معاشرے اور روشن امکانات کی تلاش وجستجو کے وسیع منظرنامے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

'مضطراب سخن' میں شوکت پرویسی کی نظمیں، گیتیں اور تہنیتی پیغامات شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل بیشتر نظمیں احساس کی شدت، صلابت فکر اور شرافت کاوش سے پُر ہیں۔

شوکت پرویسی کی نظم گوئی پر اظہار خیال کرتے ہوئے شاہ اجمل فاروق ندوی لکھتے ہیں: "کرب و رومان کا یہ حسین امتزاج شوکت پرویسی کو اپنے ہم عصر شاعر فیض احمد فیض کے بہت قریب پہنچا دیتا ہے۔ بے تابی دل، استعارہ صبح، تخیل و تخیلات، انتظار، طلسم ذات، منزل مقصود، نیا سفر، مایوس انتظار اور ان جیسے متعدد موضوعات تخیلاتی و رومانی دنیا کے حسین استعارے بھی ہیں اور عہد نو کے مسائل کی جانب مفید اشارے بھی۔

درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

افسوس ہیں، افسوس، جو ناکام مقصد کے لیے خواہاں
الفت، اپنے عمل سے اپنی حیات کو کامراں بنادو

نہ دیکھو او نچی عمارتوں کو انہیں گرانے سے فائدہ کیا
تم اپنی بستی کا جائزہ لو تم اپنے کو آسماں بنا دو

شوکت پرویسی کی نظموں میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے جہاں زندگی کا جمال بھی ہے اور فن کا کمال بھی۔ ان کی نظموں میں داخلی معاملات بھی ہیں اور خارجی واردات بھی، حسن و عشق کی معاملہ بندی اور صالح عناصر کی فضابندی بھی۔ آہنگ کے اعتبار سے ان کی نظمیں رومانیت سے بھرپور ہیں لیکن ان کی شاعری کو رومانیت کے دائرے میں رکھنا قدرے مشکل امر ہے۔ بہ قول سید راشد حامدی، شوکت پرویسی رومانیت میں بے مہار آزادی اور جمالیاتی عریانیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ ظلم پر شب خون مارتے ہیں اور نظم کے اختتام تک وہ صالح معنویت جو نظم کی ابتدا میں اکثر غائب یا دبی ہوئی نظر آتی ہے، رومانی اور جمالیاتی فضابندی کو تہس نہس کرکے فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ جاتی ہے۔ درج ذیل نظم کے ایک بند کو دیکھیے جس سے اس بات کا احساس ہوگا:

پلکوں کے ساگر میں جیسے پھر کوئی طوفان اٹھا ہے
بستی کا خاموش سینہ پھر ساحل کو چھوڑ چلا ہے
پھر بھی ہے تو حیرت، ہر منظر اندھا ہے
حال کی گہری تاریکی میں مستقبل کو ڈھونڈ رہا ہے

وہ پنچھی بھر لہرائے ہیں
جن کو نظریں بھول رہی تھی

مرتب نے اس مجموعے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ان کی 106 نظمیں شامل کی گئی ہیں دوسرے حصے میں 14 گیت، تیسرے حصے میں تین تہنیتی پیغامات اور متفرقات کے تحت تین نظمیں شامل ہیں۔ مرتب نے اس کتاب کو بہت ہی محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے جس میں نظم کی تاریخ کتابت اور تاریخ اشاعت و مقام بھی تحریر کیا گیا ہے اور کچھ نظموں کے شروع میں مختصر نوٹ بھی شامل کیا گیا ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

●●●

نام کتاب - شبلی کی ادبی و فکری جہات
مصنف : ڈاکٹر شمس بدایونی
ضخامت : ۲۰۰ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس ۱۹، شبلی روڈ
اعظم گڑھ - ۲۷۶۰۰۱
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

علامہ شبلی کے علمی، ادبی اور فکری جہات پر دارالمصنّفین کے تحت جو منصوبہ بند کام ہو رہا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ شبلی کی تحریریں نہ صرف ماضی کی آئینہ دار ہیں بلکہ ان کی معنویت موجودہ دور میں بھی مسلّم ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، انشا پرداز، مورخ، سوانح نگار، سیرت نگار اور عالم دین تھے۔ بہ قول ڈاکٹر شمس وہ سرسید کے بعد سب سے بڑے ماہر اسلامیات تھے، اردو شاعری میں ترقی پسندی کی نقیب تھے اور ہندستان میں فارسی غزل کے حرف آخر تھے۔ زیر نظر کتاب علامہ شبلی پر ۱۹۹۵ سے ۲۰۱۲ء کے درمیان لکھے گئے چھ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں بیشتر مختلف رسالوں میں پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔

مجموعے کا پہلا مضمون 'اردو تحقیق میں مولانا شبلی کی اولیات' ہے جس میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ باوجودیکہ شبلی کو نظریاتی اور عملی تنقید کا بنیاد گزار مانا گیا مگر انھیں اردو تحقیق کا مرد میدان تسلیم نہیں کیا گیا جس کے لیے بنیادی طور پر محمود شیرانی کو ذمے دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس فراموشی کے لیے مصنف نے کئی وجوہات درج کیے ہیں۔ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق اور ان کے ہم کاروں نے شبلی کو سرسید کے حریف کے طور پر پیش کیا۔ بہ قول مصنف "انھوں (شبلی) نے اپنے تصنیفی عمل میں استدلال اور اثبات مدعا کے لیے تحقیق کے کچھ ایسے اصولوں اور ضابطوں سے کام لیا جو اس عہد کے کسی دوسرے مصنف کے یہاں تواتر و اہتمام کے ساتھ نظر نہیں آتے، یہ اصول اور ضابطے ہی آج ادبی تحقیق کی اولین روایت قرار دیے جاسکتے ہیں مثلاً ماخذ، مواد کی تلاش و تفتیش، حوالوں کا فٹ نوٹ، راوی و روایت، تحقیق منسوبات اور تدوین متن"۔ شبلی کی تحقیقات کا موضوع عموماً مذہبی شخصیات، مذہبی موضوعات یا تاریخ رہے ہیں۔ بہ قول مالک رام "شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں۔" ان کی تحقیق کے بارے میں مصنف مزید لکھتے ہیں کہ "تحقیق کے بنیادی طور پر دو مرحلے ہیں، انکشاف حقائق اور امتزاج نتائج، شبلی دونوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تھے۔"

دوسرے مضمون کا عنوان ہے 'مولانا شبلی کے خطوط - تدوین جدید کی ضرورت'۔ اس مضمون میں شمس بدایونی نے مکتوباتی ادب کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ غالب اور اقبال کی طرح ہی شبلی کے مکتوبات، جو ۳۳ سال کا قومی روزنامچہ ہیں، بہت اہم ہیں اور ان پر پوری طرح سے ریسرچ کیا جانا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کی ذہنی و فکری تاریخ، اجتماعی سوچ اور ان کے قائدین کی جد و جہد کا آئینہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں شبلی کے سوانحی گوشوں اور علمی و ادبی مباحث پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں کہ "یہ خطوط زندگی کی حرارت سے معمور ہیں؛ ان میں مکتوب نگار کا بے ریا چہرہ، مزاج کی نفاست، ذوق کی رنگارنگی و لطافت، حوصلے کا عزم، احساس کی حدت اور جذبات کی تمازت صاف محسوس ہوتی ہے۔" اس باب میں مکاتیب شبلی، خطوط شبلی، خطوط مشاہیر، باقیات شبلی، خطوط شبلی بنام آزاد، مکتوبات مشاہیر اور متفرق رسائل و کتب میں منتشر خطوط کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بقول مصنف شبلی کے خطوط کی کل تعداد ۱۰۱۹ ہے۔

تیسرا مضمون 'شبلی بہ حیثیت اردو شاعر' دبستان شبلی کے بانی علامہ شبلی کی شاعری پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ اس مضمون میں شبلی کی حیات، شاعری سے انس، فارسی اور عربی میں طبع آزمائی اور تلامذہ وغیرہ کے بارے میں جانکاری دی گئی ہے۔ بہ قول مصنف فارسی میں شبلی نے ۳۸ سال طبع آزمائی کی اور قصیدے، مثنوی، مخمس، مسدس، غزلیں، مرثیے اور نظمیں لکھیں۔ ان کے اردو کلام میں واضح طور پر دو ادوار نظر آتے ہیں۔ ۱۸۸۳ سے پہلے جس میں تغزل کا روایتی اسلوب نمایاں ہے اور مابعد ۱۸۸۳، جس میں زیادہ تر مثنویاں، شخصی مرثیے اور موضوعاتی، مذہبی، اصلاحی اور اخلاقی نظمیں رقم کی گئیں۔ ان نظموں میں غیر معمولی شعریت اور اشاریت نظر آتی ہے۔ بہ قول آل احمد سرور "شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال کہاں ہوتے۔" (ص ۹۹)

'دانشوری کی روایت اور شبلی نعمانی' کے عنوان سے شامل چوتھا مضمون شبلی کے مکاتیب کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے جس میں اردو کے پہلے دانشور سرسید کے بعد دوسرے درجے پر شبلی کو دانشور مانا گیا ہے۔ بقول شمس بدایونی "سرسید اور شبلی دونوں قدامت سے جدیدیت تک آئے تھے۔ دونوں کے یہاں دانشوری علم کے راستے سے آئی تھی۔ لیکن سرسید اور شبلی کی عملی سوچ میں نمایاں فرق ہے۔ شبلی علم میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پانے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ سرسید اختیاری عمل کے ساتھ دنیوی فلاح کی راہ بھی تلاش کرتے ہیں۔" وہ مزید لکھتے ہیں کہ "شبلی نے ذاتی طور پر ندوہ کو متحد کرنے، نصاب تعلیم میں نئی راہیں نکالنے، اشاعت اسلام کے لیے تدبیریں اختیار کرنے، عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے، تصنیفی و تالیفی مشاغل کو فروغ دینے، سیاسیات میں حصہ لینے، ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے، قومی معاملات و مسائل کو حل کرنے، نئے افکار و نظریات سے استفادہ کرنے اور قوم میں آزادی کا جوش پیدا کرنے میں جو سرگرم اور مخلصانہ کردار ادا کیا، اس نے قوم کے خیالات میں ایک انقلاب برپا کیا۔"

کتاب کا پانچواں مضمون 'مولانا شبلی کا غیر مدون اردو کلام' ہے جس میں شبلی کے منتشر اردو کلام کو تاریخی اعتبار سے مع ماخذ جمع کیا گیا ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں، متفرق اشعار بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

جذبۂ دل کا ذرا دیکھو اثر
تیر اگلا بھی تو پیکاں رہ گیا

پوچھتے کیا ہو، جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا

میں تھا یا دیدۂ خوں نابہ فشاں تھی شب ہجر
ان کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا

اے تجھیزِ قیامت ہی پر رکھو پرسش
میں ذرا عمر گزشتہ کی تلافی کرلوں

دل کی، جگر کی، جسم کی، پہلو کی، جان کی
آنسو بجھائیں آگ یہ کس کس مکان کی

آخری مضمون 'جہان شبلی' تین ابواب (اول، دوم اور سوم) میں بانٹا گیا ہے جن میں شبلی اور متعلقات شبلی پر منتشر ریزہ ریزہ معلومات و حقائق جمع کیے گئے ہیں۔ ان ابواب میں شبلی کے ذاتی ارتقا، مشاہیر کی آرا اور ان کے خطوط سے کئی نتائج اخذ کیے گئے ہیں جو شبلی کی زندگی اور فکر و فن کو سمجھنے کے لیے کارآمد ہے۔ کتاب کے آخر میں 'شبلی کے خطوط' کے عنوان سے ایک ضمیمہ بھی پیش کیا گیا ہے جس سے ان کے خطوط کے دستخط و کیفیت، مکتوب الیہم کے نام اور ان کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن میں یہ خطوط شامل اشاعت ہیں۔

غرض یہ کہ مذکورہ کتاب شبلی کی حیات، نظریات، فکر و خیال، تصور قومیت اور آزادی، شاعری، دانشوری، عملی زندگی، سرسید سے ان کے تعلقات اور نظریاتی تصادم پر مختصر ہی سہی مگر سیر حاصل نظر ڈالتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شبلیات کے تعلق سے یہ ایک اہم اضافہ ہے۔

●●●

بقیہ: ترقی پسند تحریک اور الہ آباد

صفحہ ۸ سے آگے

گیا، جس میں جدیدیوں کے حملوں کا بھرپور جواب اردو کے ترقی پسند مصنفین کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ ان جواب دینے والوں میں مشہور ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ مگر اب اس جماعت کے آئیڈیلس میں خاصا ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ترقی پسندوں کی سرگرمیاں محدود ہو گئیں۔ مجھے یاد نہیں کہ ترقی پسند مصنفین کے نام پر پھر کوئی اجتماع بھی ہوا ہو۔

آخری کانفرنس جنوری ۱۹۷۳ء میں ہندوستانی اکیڈمی کے ہال میں دو دن ہوئی جس میں الہ آباد کے باہر سے رضیہ سجاد ظہیر، محمد حسن، قمر رئیس، وشوا ناتھ ترپاٹھی، تقی حیدر، اجمل اجملی، اشک صاحب، رتن سنگھ، امیر عارفی اور شارب ردولوی نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ترقی پسند افسانے کے نئے مسائل پر باتیں ہوئیں۔ کچھ افسانے بھی پڑھے گئے۔ الہ آباد سے ہندی کے ادیبوں میں مارکنڈے، دودھ ناتھ سنگھ، امر کانت اور رام سروپ چترویدی شامل تھے۔ اردو کے نوجوان لکھنے والوں میں جعفر عباس، علی احمد فاطمی، اسرار گاندھی اور فخر الکریم نے مقالے بھی پیش کیے تھے۔ نئی زمانہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن پھر بہت فعال ہو گئی ہے۔ انجمن کی باقاعدہ نشستیں ہونے لگی ہیں جن میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ الہ آباد کے نوجوانوں نے پھر ایک مرتبہ کمر ہمت باندھ لی ہے اور ہمارا یہ اجتماع انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

○○○

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

میڈیم اسکول بند ہو چکے ہیں، کئی دوسرے اسکولوں میں ضم کر دیے گئے اور کئی اسکول اب بند ہو جانے کے دہانے پر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خود کو مسلمانوں کا ہمدرد قرار دینے والی کانگریس کی سرکار نے ہی دہلی میں اردو کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت نجیب جنگ لیفٹننٹ گورنر ہیں اور عنانِ حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے، اگر اب بھی دہلی کے اسکولوں میں اردو میڈیم کے اساتذہ کی بحالی نہیں ہو پائی تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہوگی۔ معروف این جی او دی رائٹ وے کے صدر شکیل احمد راہ کا کہنا ہے کہ دہلی میں شیلا دکشت کی سرکار کے زمانے میں عدالت کے حکم کے بعد ایس ایس بی کے ذریعے اردو اساتذہ کی بحالی کا جو عمل شروع ہوا تھا، اسے نوکر شاہی نے کبھی آڑے آتے ہوئے اور کبھی کسی اور بہانے سے عمل تعطل ہونے دیا اور آخر میں اسمبلی الیکشن کے اعلان کے باعث انتخابی ضابطۂ اخلاق نافذ ہو جانے کے بہانے التوا میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس عمل کو دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کو فوری طور سے دوبارہ شروع کرانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں لوک سبھا کا الیکشن ہو چکا ہے، اس لیے اب الیکشن کمیشن کو اس عمل کو دوبارہ شروع کرنے کی اجازت دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

دوسری اور آخری قسط

ترقی پسند تحریک اور الہ آباد

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی (B-80، محمود منزل، دریاباد، الہ آباد، یوپی)

اس وقت ترقی پسندوں کے دو رسالے الہ آباد سے شائع ہوتے تھے جن میں ترقی پسند شعرا کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔ ایک رسالہ اعجاز صاحب کا 'شعاع اردو' تھا جو بعد کو 'کارواں' ہو گیا اور دوسرا بلونت سنگھ اور محمود احمد ہنر کی ادارت میں 'فسانہ' فسانہ کرنے سے نکلتا تھا۔ اس میں صرف افسانے شائع ہوتے تھے۔ ہنر صاحب کے ساتھ اطہر پرویز اور کلیم مخلص (بعد کو) شامل تھے۔ اس رسالے میں بلونت سنگھ، بیدی، اشک صاحب اور صدیقہ بیگم سیوہاروی بطور خاص لکھتے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صدیقہ بیگم سیوہاروی کی شہرت، فسانہ سے ہی شروع ہوئی تھی۔ ترقی پسندوں کے جلسے کبھی رام پرتاپ بہادر کے گھر، کبھی فراق صاحب کے گھر اور زیادہ تر اعجاز صاحب کے گھر پر ہوتے، جس میں ہندی اردو، دونوں کے ادیب شامل ہوتے، کوئی نیا افسانہ کہیں چھپتا، نئی نظم آتی یا کوئی ادبی نظریاتی مسئلہ چھڑتا تو ہم لوگ ان پر کھل کر بحثیں کرتے۔ ہندی کے نوجوان ادیبوں میں امرکانت، مارکنڈے، بھیرو پرساد گپت، نرلوچن شاستری، شمشیر بہادر، کملیشور اور دشینت کمار بطور خاص ان جلسوں میں آتے۔ دشینت کمار ان ہی دنوں ہندی زبان میں اردو غزل کے تجربے کر رہے تھے۔ بڑی خوش الحانی سے اپنی تخلیقات پیش کرتے ان کی شاعری میں اردو والوں کو اپنی آواز سنائی دیتی۔ ادھر واثق صاحب کی 'بینا بازار' ہر مشاعرے میں ان سے فرمائش کرکے ضرور سنی جاتی۔ دشینت کمار کی غزل 'ابھی تو آدھا پتھ چلے' ہر محفل کی جان بن گئی تھی۔

انہی دنوں ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں انجمن کے کئی ڈرامے اسٹیج کے لیے چنے گئے، جن کی روح رواں محترمہ ریکھا جین تھیں جو ہندی کے مشہور آلوچک نیمی چندر جین کی بیوی تھیں۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی کی پلکوں میں آنسو، چھپی جس میں دلی اور پنجاب کے کشت وخون پر بڑی اچھی کہانیاں تھیں۔ بھیرو پرساد گپت کی کہانی 'گنگا' اتنی پسند کی گئی کہ بعد کو یہی کہانی ان کی پہچان بن گئی۔ لوگ اکثر مذاق میں بھیرو پرساد ہی کو گنگا کہنے لگے۔ یہی زمانہ تھا جب فراق صاحب کی مشہور نظم 'آدھی رات' اور 'داستان آدم' مکمل ہوئی۔ فراق صاحب اپنی زیادہ تر نظمیں ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں سناتے تھے۔ یہ نظم فراق صاحب نے اعجاز صاحب کے یہاں ترقی پسندوں کی ایک نشست میں سنائی تھی اور 'داستان آدم' پر بحث بھی خاصی ہوئی تھی۔ دیوبند اختر نے اس نظم پر مارکسی نقطۂ نظر سے بڑی اچھی بحث کی تھی۔

غالباً اکتوبر ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا کہ الہ آباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین ایک اور مسئلے سے دوچار ہوئی۔ الہ آباد سے نکلنے والے ہندی کے ایک رسالے 'مایا' نے خواجہ احمد عباس کی فسادات پر ایک کہانی 'سردار جی' شائع کی۔ کہانی بہت اچھی تھی اور دلی، پنجاب کے فسادات سے متعلق تھی جس میں ایک سردار جی نے اپنی جان پر کھیل کر ایک مسلمان خاندان کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ کہانی جذبۂ ایثار سے پُر تھی مگر ابتدا میں خواجہ احمد عباس نے سرداروں سے متعلق کچھ لطیفے بھی لکھ دیے تھے۔ بس پھر کیا تھا کچھ متعصب لوگوں نے الہ آباد کی سنگھ سبھا کے سرداروں کو تان کر... خواجہ احمد عباس کو الہ آباد آنا پڑا اور پھر وہ تقریباً چھ ماہ تک الہ آباد میں رہے۔ ترقی پسند مصنفین کے اس وقت کے جلسے میں ہندی اردو کہانی کاروں کا ایک مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا۔ عدالت کی کوشش میں غالباً بیدی بھی خواجہ احمد عباس اور ترقی پسندوں کی طرف سے پیش ہوئے۔ آخر ان دنوں کی کورٹ سے جج ہائیکورٹ نے جب اس کہانی کے اچھی ہونے کی سند دی تو مقدمہ فیصل ہو گیا۔ مگر خواجہ احمد عباس نے کہانی کا نام بدل دیا۔ اب اس کہانی کا نام 'میری موت' ہے۔ سنا ہے کہ ادھر پھر اس کہانی کا شاخسانہ چھیڑا گیا ہے۔ کچھ جلسے سری کرشن داس، اعجاز صاحب اور کچھ جلسے امرت رائے کے گھر پر بھی ہوتے۔ سری کرشن داس اور خواجہ احمد عباس کی ادارت میں 'سنگم' نام سے ایک ہندی رسالہ بھی نکالنے کا پروگرام بنا۔ مجھے یاد نہیں کہ پھر وہ رسالہ نکلا یا نہیں۔ کملیشور میرے ساتھ یونیورسٹی میں تھے اور مارکنڈے، وہ ایک سال مجھ سے پیچھے۔ الہ آباد کے سول لائنز میں ایک کمرہ کرایے پر لے لیا گیا۔ وہیں یہ دل چسپ نشستیں ہوتیں۔ ایک نشست میں رام بلاس شرما اور بیدی بھی شریک ہوئے۔ بیدی نے اپنی مشہور کہانی 'انجام' الہ آباد کے یہاں سے واپس جانے کے بعد لکھی جس میں فراق صاحب کا کردار یوگی کے نام سے دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ترقی پسندوں کی سب سے اہم کانفرنس پریاگ سنگیت سمیتی رام باغ میں ہوئی۔ اس میں رام بلاس شرما، ناگ ارجن، ڈاکٹر عبدالعلیم، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، واثق وفراق وغیرہ شامل تھے۔ یہ کانفرنس دو دن تک چلتی رہی۔ اس میں ہندی والوں کی طرف سے رام داس شرما پر خاصے اعتراضات ہوئے تھے۔ رات میں ایک بہت بڑا مشاعرہ بھی ہوا پھر ایک عوامی مشاعرے کا انتظام پرشوتم داس ٹنڈن پارک میں ہوا، جس میں ڈاکٹر علیم، رام بلاس شرما، باقر مہدی، سردار جعفری اور پریم دھون شریک ہوئے۔ ہڑتالوں کا مجمع پریم دھون کا عوامی گانا 'آج ہڑتال، آج چکا جام بند اور چل میرے گھوڑے، چلا چل' سننے کے لیے پارک سے باہر سڑکوں پر کھڑا تھا۔ اس وقت تک پریم دھون فلمی دنیا میں نہیں گئے تھے۔

کچھ دنوں بعد الہ آباد کے نوجوان جو ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے، اپنے اپنے کاموں میں لگ کر دوسرے شہروں میں چلے گئے۔ یونیورسٹی میں نوجوانوں نے ایک مارکسسٹ کلب کھول رکھا تھا جس میں طلبہ کے ساتھ اساتذہ بھی شامل ہوتے، جن میں ڈاکٹر زواتے، امبا دت پنت، ڈاکٹر ستیش چندر، پروفیسر آشا رام، ڈاکٹر اطہر انصاری، اقبال احمد بطور خاص شامل ہوتے۔ سب ختم ہو گیا اور پھر ترقی پسند مصنفین کا زور ہندی اردو دونوں میں خاصا گھٹ گیا۔ تاہم پندرہ دن میں ایک نشست پرکاش چندر گپت کی کوششوں سے ہونے لگی۔ ([illegible]) سویٹ مارٹ، سول لائنز کے پاس پنک روز نام کا ایک ریستوراں کھلا۔ اسے ترقی پسندوں نے اپنا اڈا بنا لیا۔ اس میں بھی کچھ نشستیں بڑے زور شور کی ہوئیں جن میں پہاڑی، نرلوچن شاستری، اچانک، راقم الحروف، ضیاء الحق، اعجاز صاحب، احتشام حسین اور کبھی کبھی امرت رائے بھی شامل ہوتے۔ مگر یہ نشستیں زیادہ دنوں تک نہ چل سکیں کہ کم وبیش انہی دنوں چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے سے شکست دنیا میں ایک طرح کی بے اعتباری آنے لگی۔ ہمارے بہت سے نئے لکھنے والوں نے ترقی پسندوں سے الگ ہو کر کچھ دوسرے راستے ڈھال لیے۔ پرانے لوگوں میں سے اکثر لوگ چل بسے، جو رہ گئے وہ بھی اب لوگوں کو متحد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک دوسرے سے ملاقات کے دفتر کھل گئے۔ نتیجے کے طور پر الہ آباد کے ترقی پسندوں میں خاصا بکھراؤ پیدا ہو گیا۔ علامت نگاروں کے دور عروج میں پھر یہاں کے ترقی پسندوں نے متحد ہونا شروع کیا۔ ایک رسالہ 'شب رنگ' ابھی حال تک سے نکلا

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں | مطبوعہ: قمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org